ہمارا نصب العین اور طریق کار

یہ تمام بحث جو اس تفصیل کے ساتھ پچھلے صفحات میں کی گئی ہے، اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم مسلمانوں کو ان کے غیر مسلم ہمسایوں سے لڑانا چاہتے ہیں، یا یہ بات ان کے دل میں بٹھانا چاہتے ہیں کہ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ ان کے اشتراک عمل کی کوئی صورت نہیں ہے یا یہ کہ ہم ان کو نفس آزادی ہند کا مخالف بنانے کی فکر میں ہیں محض اس خوف سے کہ ہندو یہاں کثیر التعداد ہیں اور وہ ہم کو کھا جائیں گے کچھ لوگ سمجھ بوجھ کی کمی کے سبب سے، اور کچھ دوسرے لوگ ہوشیاری کی زیادتی کے باعث ہمارے دلائل سن کر بے صبری کیساتھ اسی نوعیت کے شبہات پیش کرنے لگتے ہیں لیکن ہمارا مدعا دراصل کچھ اور ہے جس کی طرف اپنے مقدمہ میں ہم پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں اور اب ذرا زیادہ تفصیلی صورت میں اسے پیش کرتے ہیں۔

اس وقت ہندوستان میں ہمارے سامنے اصلی سوال یہ نہیں ہے کہ ہمیں اپنی ہمسایہ اقوام کے ساتھ اشتراک عمل کرنا چاہیے یا نہیں۔ ہم آزادی وطن کیلئے جد وجہد کریں یا معطل ہو کر بیٹھے رہیں ہمسایہ قوموں کے ساتھ مل کر چلیں یا لڑ کر گذر کریں۔ اس باب میں ظاہر ہے کہ دو رائیں نہیں ہو سکتیں کم از کم کوئی ذی ہوش آدمی تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ مسلمان یہاں تمام دوسری قوموں سے قطع تعلق کر کے بھی رہ سکتے ہیں، یا یہ کہ انہیں آزادی کی ضرورت نہیں ہے، یا یہ کہ ہمسایوں کے درمیان تعلقات کی تلخی اور آئے دن کی سر پھٹول اور اجنبی حکمرانوں کا اس سے فائدہ اٹھانا کوئی مرغوب چیز ہے۔ اسی طرح ہمارے سامنے اصلی سوال یہ بھی نہیں ہے کہ اس ملک کے نظام حکومت کا ارتقاء جمہوریت کے راستہ پہ ہو یا کسی دوسرے راستہ پہ کوئی خردمند نفس جمہوریت کی مخالفت نہیں کر سکتا، اور نہ یہ کہہ سکتا ہے کہ یہاں پادشاہی، یا امراء گردی دارسٹا کریسی یا اور

کسی طرز کی حکومت ہونی چاہئے۔ درحقیقت جو سوال ہمارے لئے ایک مدت سے پریشان کن بنا ہوا ہے، اور روز بروز زیادہ پریشان کن بنتا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ گذشتہ ستر اسی سال سے ہندوستان میں انگریزوں کی غلط رہنمائی و فرمانروائی اور ہندوؤں کی خوش نصیبی و خود غرضی کے سبب سے نظام حکومت کا نشوو ارتقاء واحد قومیت کے مفروضے پر جمہوری طرزِ ادارہ کی صورت میں ہو رہا ہے۔ نفس جمہوریت کو اور اُس جمہوری طرزِ ادارہ کو جو واحد قومیت کے مفروضہ پر مبنی ہو، ایک دوسرے سے خلط ملط نہ کرنا چاہئے۔ دونوں میں زمین و آسمان کا بُعد ہے اور ایک سے اختلاف کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم دوسرے سے اختلاف کر رہے ہیں ——

اب حقیقت نفس الامری تو یہ ہے کہ یہاں واحد قومیت موجود نہیں ہے اور واحد قومیت جن بنیادوں پر تعمیر ہو سکتی ہے وہ بھی موجود نہیں ہیں لیکن فرض یہ کر لیا گیا ہے کہ ہم ہندو، مسلمان، اچھوت، سکھ، عیسائی وغیرہ سب ایک جغرافی نام اور ایک سیاسی نظام رکھنے والے ملک میں پیدا ہونے اور رہنے سہنے کی وجہ سے ایک قوم ہیں لہٰذا ہمارے درمیان جمہوریت کا یہ قاعدہ جاری ہو سکتا ہے اور ہونا چاہئے کہ ہم میں سے جو جماعت کثیر التعداد ہو اسی کی مرضی کے مطابق حکومت چلے۔ اسی نظریہ کی بنا پر دستورِ حکومت بنایا گیا ہے اور آئندہ جو دستوری ارتقاء ہونے والا ہے اس کے لئے یہی راستہ متعین کر دیا گیا ہے۔ انگریز اپنے نزدیک اسی کو صحیح سمجھتا ہے اور اسکے پاس طاقت ہے جسکے بل پر وہ ہندوستان کو اس راستہ پر لئے جا رہا ہے۔ ہندو اپنے لئے اس کو سراسر مفید پاتا ہے اور وہ قوم پرستانہ جوش کے ساتھ اس پر جانے کے لئے آمادہ ہے۔ اس صورت حال نے اس کے لئے ہندو قوم پرستی اور ہندوستانی وطن پرستی دونوں کو ایک کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وطن کی سچی محبت کا تقاضا یہی ہے کہ اس کو آزادی اور خود مختاری ایسے ہی جمہوری نظام کی شکل میں حاصل ہو۔ ہندو قوم پرستی کے جتنے حوصلے اس کے سینے میں فطری طور پر پیدا ہوتے ہیں وہ بھی سب کے سب اسی ایک چیز میں پورے ہو جاتے ہیں، لہٰذا وہ اس میں نہ تو کوئی قباحت محسوس کرتا ہے، نہ اس امر کی کوئی وجہ ہے کہ وہ قباحت محسوس کرے، اور نہ اس کے لئے یا اس کے سرپرست انگریز کے لئے ان لوگوں کے

احساسات کو سمجھنا آسان ہے جو اس میں قباحت پاتے ہیں۔ اپنے سرپرست کے ساتھ اسکی کشاکش جو کچھ بھی ہے صرف اس امر میں ہے کہ یہ اس راستہ پر جلدی بڑھنا چاہتا ہے اور دور تک پہنچ جانا چاہتا ہے اور وہ اسکی خواہشات کو پورا کر دینے میں تامل کر رہا ہے۔ مگر ہمارا معاملہ بالکل برعکس ہے۔ ہمارے لئے اس نظام میں قباحت ہے، اور اس کی مزید ترقی میں مضرت ہے اور اسکی تکمیل میں ہلاکت ہے۔ ہندو کے برخلاف ہمارا حال یہ ہے کہ اس نظام میں ہمارے قومی حوصلے پورے نہیں ہوتے بلکہ ان کا گلا گھٹ جاتا ہے، انکی جڑ کٹ جاتی ہے اسلئے کہ ہم شمار میں کم ہیں، اور یہ نظام جو کچھ دیتا ہے ان کو دیتا ہے جو شمار میں زیادہ ہوں۔ جو کچھ یہ دیتا ہے اگر ہم اسے لینا چاہیں تو لازم آتا ہے کہ اپنی قومی خودی کو خود ہی مٹا دیں، اور اگر ہم اپنی خودی کو باقی رکھنا چاہیں تو یہ ہمیں کچھ نہیں دیتا جس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دستوری ارتقاء کے ساتھ ساتھ تمام طاقت دوسروں کے ہاتھ میں چلی جائے اور وہ بزور ہماری خودی کو مٹائیں۔ اس صورت حال نے ہم کو ایسی جگہ لاکر کھڑا کر دیا ہے جہاں ہمیں صرف یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ خودکشی اور سزائے موت میں سے کسی ایک چیز کو منتخب کر لیں۔ ہمارے سامنے زندگی اور آزادی پیش ہی نہیں کی جاتی بلکہ صرف یہ چیز پیش کی جاتی ہے کہ یا تو اپنے وجود کی خود نفی کر دو، یا پھر اپنے آپ کو سپرد کر دو تاکہ یہ نفی کرنے کی خدمت دوسرے انجام دے دیں پس جو سوال ہم کو حل کرنا ہے وہ یہ ہے کہ یہ چکر جس میں لاکر ہم پھنسا دیئے گئے ہیں اس سے نکلنے کی بھی کوئی صورت ہے یا نہیں؟

دوسری قلیل التعداد قوموں کی پوزیشن کیا ہے؟ اس کا فیصلہ ہم نہیں کر سکتے۔ یہ ان کا اپنا کام ہے کہ اسکو سمجھیں اور رائے قائم کریں کہ واحد قومیت پر جمہوری نظام کی تعمیر کے منطقی اور واقعی نتائج انہیں قبول ہیں یا نہیں۔ ہم صرف اپنی پوزیشن کو پوری طرح سمجھ سکتے ہیں اور اسی کے متعلق ٹھیک طور پر کہہ سکتے ہیں ہم ایک مستقل قوم ہیں جس کی اجتماعی زندگی ایک مخصوص اخلاقی و تمدنی قانون پر مبنی ہے۔ اکثریت کی قوم میں اور ہم میں اساسی اور اصولی اختلافات ہیں۔ اس کے اخلاقی و تمدنی اصول ہمارے اصولوں سے مختلف ہیں۔ جب تک یہ اختلاف باقی ہے، یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ہم اور وہ من کل الوجوہ ایک ہو جائیں

جن امور کو مشترک کہا جاتا ہے ان میں بھی تفصیلات پر پہنچ کر ہمارے اور ان کے درمیان اختلاف، نقطۂ نظر کا، مقاصد اور ضروریات کا، اصولوں اور طریقوں کا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً تعلیم کو لیجیے جہالت کو دور کرنا اور تعلیم کو عام کرنا اور کارآمد تعلیم دینا ہم بھی چاہتے ہیں اور وہ بھی۔ اس حد تک ہمارے اور ان کے درمیان اشتراک ہے اور ہم بڑی خوشی کے ساتھ اس کارِ خیر میں ان کے ساتھ مل کر جدوجہد کر سکتے ہیں۔ مگر تعلیم کا مسئلہ تخلیق مقصدِ حیات، تعمیرِ ذہنیت، تشکیلِ اخلاق، تصویرِ عادات، اور فی الجملہ اس نیشنل ٹائپ کی پرورش کے ساتھ لازمی طور پر جڑا ہوا ہے جسے ایک قوم اپنے اسلاف سے پاتی ہے اور اپنی آئندہ نسلوں میں ترقی کے ساتھ برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ تعلیم کی اس تفصیلی صورت میں ہمارے اور ان کے درمیان اتفاق نہیں ہے۔ ہم یہ ضرور چاہیں گے کہ ہماری اور اُن کی آئندہ نسلوں میں حسنِ سلوک ہو، سنجوگ ہو، شریفانہ ہمسائیگی کے تعلقات ہوں اور یہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ہندوستان کی بھلائی کے لئے کام کریں مگر یہ سب کچھ ہم اپنے نیشنل ٹائپ کا تسلسل قائم رکھنے کے ساتھ چاہیں گے، نہ یہ کہ ہمارا نیشنل ٹائپ ان کے ٹائپ میں گم ہو جائے، یا دونوں گڈمڈ ہو کر اسی بھوسماجی یا کبیر پنتھی وضع کے ٹائپ میں تبدیل ہو جائیں۔ لہٰذا تعلیمِ عمومی کے مسئلہ میں ہمارے اور ان کے درمیان کلی اشتراکِ عمل ممکن نہیں، نہ یہ ممکن ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک اپنی آئندہ نسل کو اطمینان کیساتھ دوسرے کے حوالہ کر دے اور اسے اختیار دے دے کہ ان کچی لکڑیوں کو جس صورت کا چاہے بنائے۔ ایسا ہی حال زندگی کے دوسرے اہم مسائل کا بھی ہے۔ خوشحالی ہم بھی چاہتے ہیں، مگر ہمارے اور ان کے معاشی اصول، مناہج، مسائل بالکل یکساں نہیں ہیں۔ اصلاحِ معاشرت کے ہم بھی خواہاں ہیں۔ مگر اصلاح کے مفہوم و معیار اور معاشرت کے اصول و قوانین میں ہم اور وہ بالکل متفق نہیں ہیں۔ تمدنی ترقی ہمیں بھی مطلوب ہے، مگر تمدن کے قالب میں جو

روح کام کرتی ہے، اور جو روح اس کی ترقی کا راستہ معین کرتی ہے وہ ہمارے اور ان کے درمیان بالکل ایک نہیں ہے ـــ پنڈت جواہر لال اور ان کی طرح کے سطح بیں لوگوں کے لئے یہ کہہ دینا آسان ہے کہ اس سائنٹفک تمدن کے دور میں ریل، ہوائی جہاز، ریڈیو اور کثیر پیداوری (MASS - PRO - DUCTION) نے قوموں کے حدود امتیاز کو توڑ دیا ہے اور اب قومی تمدنوں کا زمانہ ختم ہو گیا۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ اس وقت جو تمدن پھیل رہا ہے اس کی یہ خاص صورت مغربی تہذیب نے بنائی ہے اور اس تہذیب کو دنیا پر چھا جانے کا موقع اسلئے مل گیا ہے کہ وہ سائنس کے طاقتور وسائل سے کام لے رہی ہے۔ یہی وسائل ہماری تہذیب کے ہاتھ آجائیں تو وہ اس سے زیادہ صالح اور زیادہ درخشاں تمدن پیدا کریگی اور وہ بھی اسی طرح قوموں کی حدود امتیاز کو توڑ کر انکے گھروں تک گھستا چلا جائیگا۔ لہذا پنڈت جی جیسے حضرات کی زبان سے بس یہ خبر سُن کر کہ اب قومی تمدنوں کا زمانہ لد گیا ہے، ہم ہتھیار نہ ڈال دینگے اور نہ اس بات کیلئے راضی ہونگے کہ جو تمدن پھیل رہا ہے اسی میں اپنے آپ کو گم کر دیں ـــ خلاصہ یہ کہ ہماری اور انکی راہیں متوازی (PARELLEL) تو چل سکتی ہیں، اور کہیں کہیں مل بھی سکتی ہیں لیکن از اول تا آخر ایک ہو جائیں، یہ کسی طرح ممکن نہیں۔

جب صورت حال یہ ہے تو ہمیں اور انکو ملا کر ایک ایسا نظام حکومت کیونکر بنایا جا سکتا ہے جس میں جمہوریت کا قاعدہ نافذ ہو؟ ہم اس بات پر کیسے راضی ہو سکتے ہیں کہ زندگی کے کسی معاملہ کا جو فیصلہ چار ہندو کر دیں اسے ایک مسلمان بھی مان لے، اور صرف اسلئے مان لے کہ یہ ایک ہے اور وہ چار ہیں خصوصاً اس زمانہ میں جبکہ حکومت کا دائرہ غیر محدود ہے اور پُرانے نظریۂ ریاست نے جتنے حرم بنائے تھے ان سب کو توڑ کر شخصی زندگی تک میں گھس گیا ہے، ہم اس اصول کو کس طرح مان سکتے ہیں۔ اس کو مان لینے کے بعد تو لامحالہ دو ہی صورتیں پیش آسکتی ہیں۔

(۱) اگر ہم حکومت میں عملاً حصہ دار بننا چاہیں تو اپنے امتیازی وجود کو خود مٹا دیں۔

(۲) اور اگر اپنے امتیازی وجود کو قائم رکھنا چاہیں تو حکومت سے عملاً بے دخل ہو جائیں۔

یہ ممکن ہے کہ اکثریت فیاضی سے کام لیکر ہمیں ان دونوں مشکلوں سے بچالے، لیکن یہ تو اسکے رحم و کرم کی بات ہے اور کوئی قوم ہمیشہ ہمیشہ کیلئے کسی دوسری قوم کے رحم و کرم پر نہ زندہ رہی ہے نہ رہ سکتی ہے۔ یہاں سوال فیاضی کا نہیں ہے بلکہ اس امر کا ہے کہ اس قسم کے جمہوری نظام کی فطرت کیا ہے ایسا جمہوری نظام جب ایک چھوٹی اور ایک بڑی قوم کو ملا کر بنایا جائیگا تو علاوہ چھوٹی قوم کو بڑی قوم کا محکوم بنا دیگا! اس میں بڑی قوم کو خود اختیاری ملے گی اور چھوٹی قوم کو بے اختیاری۔ اس میں عمومی حاکمیت کا جمہوری نظریہ قطعی باطل ہو جائیگا۔ بڑی قوم کو بہر حال حاکمیت حاصل ہو گی چاہے وہ اپنی جداگانہ قومیت پر اصرار کرے یا نہ کرے مگر چھوٹی قوم حاکمیت میں حصہ دار نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ اپنی قومیت سے دست بردار نہ ہو جائے۔ بڑی قوم اپنے تمام اصولوں پر قائم رہ سکتی ہے اور ان کو نہ صرف اپنے اوپر بلکہ دوسروں پر بھی نافذ کر سکتی ہے، مگر چھوٹی قوم کیلئے رفتہ رفتہ اپنے تمام اصولوں کو قربان کر دینا لازم آجاتا ہے۔ وہ دوسروں پر نافذ کرنا تو درکنار خود اپنے اوپر بھی انکو نافذ نہیں کر سکتی۔ اسکو اپنے اصول تہذیب پر قائم رہ کر ترقی کرنے بلکہ زندہ رہنے کا بھی موقع نہیں ملسکتا۔ اسکے اپنے ہاتھ میں کوئی ایسی طاقت نہیں آتی جس سے وہ اپنی خودی کو آپ برقرار رکھ سکے اسکی خودی دوسروں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے کہ چاہیں اسے برقرار رہنے دیں یا اپنی خودی میں جذب کر لیں۔ کیا اسکا نام آزادی ہے؟ کیا اسے جمہوریت کہتے ہیں؟ کیا یہ عمومی حاکمیت ہے؟ کیا اسکے لئے ہم لڑیں اور جانفشانی دکھائیں؟ ہمیں آزادی کیلئے لڑنے سے انکار نہیں، مگر ہم یہ پوچھتے ہیں کہ اس نوعیت کے نظام میں ہمارے لئے آزادی ہے کہاں؟ ہم جمہوریت کے مخالف نہیں، مگر ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ جس عمومی حاکمیت کو جمہوریت کہتے ہیں اسکے اندر ہمارا حصہ کہاں ہے؟ ہم اپنی ہمسایہ قوم کیساتھ اشتراک عمل کرنے سے انکار نہیں کرتے مگر سوال یہ ہے کہ اشتراک عمل کی صورت کیا ہے؟ اسکی بنیاد کیا ہے؟ مشترک زندگی کیلئے تو اشتراک عمل کرنے سے ہم انکار نہیں کرتے، مگر یہاں ہم سے کہا جاتا ہے کہ اپنی قبر کھودنے کے کام میں گورکنوں کے ساتھ اشتراک عمل کرو۔ ہمارا جھگڑا اس پر ہے کہ اشتراک عمل کی یہ

کونسی بنیاد ہے؟ ہم نے یہ تو کبھی نہیں کہا کہ ہم اپنی ہمسایہ قوم سے ملنا نہیں چاہتے اور لڑ کر گذر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ملنے کی صورت کیا ہے۔ ہم اسکے ساتھ اس صورت سے ملکر چلنے کیلئے راضی ہیں کہ ہم بھی زندہ رہیں اور وہ بھی۔ مگر وہاں قومی استعلاء و استکبار (NATIONAL INPERIALISM) کا بھوت سوار ہے اور مردم خوری کا چسکا لگ گیا ہے۔ کیا ہمیں اس بھوت سے ملنے کیلئے کہا جا رہا ہے؟ کیا اس سے بھی صلح اور دوستی ہو سکتی ہے؟

یہ باتیں ہیں جن پر ہمارے ان بھائیوں کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے جو ہمارے خیالات کو سنتے ہی آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور چیخنا شروع کر دیتے ہیں کہ تم آزادی کے مخالف ہو، اور متحدہ جد و جہد کا دروازہ بند کرتے ہو، اور انگریزی امپیریلزم کو تقویت پہنچاتے ہو۔ ہم ان سے عرض کرتے ہیں کہ بات کی پچ کرنیکی ضرورت نہیں۔ یہ معاملہ کسی شخصی جائداد یا کسی پارٹی کے گرنے اور اٹھنے کا نہیں ہے، بلکہ اس قوم کی زندگی کا ہے جس کی فلاح و بہبود کیلئے ہم اور آپ سب خدا کے سامنے جواب دہ ہیں۔ ضد اور ہٹ دھرمی شاید دنیا میں بات بنا دے مگر آخرت میں تو نہ بنا سکیگی۔ لہذا لاطائل بلند آہنگی اور بے اصل سخن پروری کو چھوڑ دیجئے اور ایمان و احتساب نفس کیساتھ سوچئے کہ جو کچھ ان صفحات میں عرض کیا جا رہا ہے وہ حق ہے یا نہیں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ فی الواقع یہ سوال ہندوستان میں امت مسلمہ کی زندگی و موت کا ہے اور اسکو حل کرنیکا یہی وقت ہے، اور اسکو آزادی ہند کا مسئلہ حل ہونے تک اٹھا رکھنا موجودہ سیاسی حالات میں صحیح نہیں ہے تو بات آسان ہو جاتی ہے! اسکے بعد صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اس چکر سے مسلمانوں کو نکالنے کی معقول صورت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینا ہمارا فرض ہے اور ہم اس فرض کو کما حقہ ادا کرنیکی کوشش کرینگے۔

سب سے پہلے ہمیں یہ طے کرنا چاہئے کہ ہم چاہتے کیا ہیں۔ پھر یہ معلوم کرنیکی ضرورت ہوگی کہ اس مقصد تک پہنچنے کا صحیح راستہ کونسا ہے۔

۱۔ ہمارے پچھلے بیان سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ واحد قومیت کا مفروضہ اور اس پر جمہوریت کی تعمیر ہی دراصل خرابی کی جڑ اور بس کی گانٹھ ہے۔ اب تک ہماری سیاسی پالیسی یہ رہی ہے کہ وطنی قومیت کے اصول کو ہم نے جوں کا

تسلیم کرنے دیا! ان جمہوری ادارات کو بھی قبول کر لیا جو اس غلط قاعدے پر بنائے جاتے ہیں! اور اپنا تمام زور صرف اس بات پر صرف کیا کہ اس بداصول دستور کے اندر کسی طرح اپنے تحفظ کا سامان کریں۔ یہ بنیادی غلطی تھی اور اب اسکے تلخ نتائج واضح طور پر ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ ... اس پوری سیاست پر نظر ثانی کریں۔ ہمیں جان لینا چاہئے کہ جس دستور حکومت کی بنیاد ان اصولوں پر ہو اس میں کسی قلیل التعداد قوم کا تحفظ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ جداگانہ انتخاب، پاسنگ (WEIGHTAGE) نشستوں کا تعین، عہدوں اور مناصب میں حصہ کی تخصیص، یہ سب قطعی بیکار ہیں جبکہ قلیل و کثیر کو ایک مجموعہ فرض کر کے کثیر کی رائے کو قوت نافذہ عطا کر دی جائے۔ خرابی کی اس جڑ کو پا لینے کے بعد ہمیں شاخوں کو چھوڑ کر اپنا پورا زور اسی کے استیصال پر صرف کرنا چاہئے۔ ہماری قومی سیاست کا اولین نصب العین اب یہ ہونا چاہئے کہ اس واحد قومیت کے مفروضہ کی دھجیاں بکھیر دیں، اور اپنی مستقل قومیت تسلیم کرائے بغیر ایک قدم آگے نہ چلنے دیں۔

۲۔ واحد قومیت کا مفروضہ ٹوٹنے کے ساتھ ہی جمہوریت کا وہ غلط نظریہ بھی آپ سے آپ پاش پاش ہو جاتا ہے جس پر ہندوستان کے موجودہ دستور کی بنا رکھی گئی ہے اور جس کو انہی خطوط پر آگے بڑھانے کے لئے کانگریس اور ہندو مہاسبھا کوشش کر رہی ہیں۔ اگر ہندوستان ایک قوم کا نہیں بلکہ کم از کم دو یا اس سے زائد قوموں کا ملک ہے تو یہاں خالص جمہوریت کے وہ اصول ہرگز نہیں چل سکتے جو صرف ایک قوم کے لئے موزوں ہیں۔۔ دو الگ قوموں کی ایک ڈیموکریسی اصولاً غلط ہے، عین اصول جمہوریت کی نفی ہے، عملاً دنیا کے کسی ملک میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے، اور یہ قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ ایسی جمہوریت دراصل ایک قوم پر دوسری قوم کی قیصریت مسلط کرنے کا مجرب نسخہ ہے ہم اس کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں کہ اس نسخہ کو یہاں ہم پر آزمایا جائے۔

۳۔ دو یا زائد قوموں کے ملک میں عمومی حاکمیت کی یہ تفسیر قطعاً غلط ہے کہ ہر باشندۂ ملک کو محض باشندۂ ملک ہونے کی حیثیت سے حاکمیت حاصل ہو۔ محض ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے دولت مشترکہ میں حصہ دار ہونا اور حاکمیت سے متمتع ہونا ہمارے لئے بالکل بے معنی اور بے کار ہوگا۔

ہماری ہندوستانیت ہماری مسلمانیت سے نہ تو منفک ہوسکتی ہے اور نہ ان دونوں کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے مسلمان کسی حال اور کسی حیثیت میں بھی غیر مسلم نہیں ہے ۔ وہ اپنے بچے کا باپ، اپنی بیوی کا شوہر، اپنے باپ کا بیٹا اور اپنے بھائی کا بھائی بھی مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہے، اور اسلام ہی کا قانون اسے بتاتا ہے کہ ان سب کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے۔ وہ اپنے اہل محلہ کا ہمسایہ، اپنے شہر والوں کا رفیق، اپنے وطن والوں کا معاون، اور اپنے بنی نوع کا بھائی بھی مسلمان ہونے کی حیثیت ہی سے ہے، اور اسلام ہی اسے ہمسایگی، رفاقت، تعاون اور برادری کے اصول و حدود بتاتا ہے ۔ انسانی تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت، اور نظم اجتماعی کے جملہ معاملات میں وہ جیسا اور جس قدر حصہ لے گا، مسلمان ہی کی حیثیت سے لے گا اس لئے کہ اس کے عین مسلمان ہونے ہی کا اقتضا یہ ہے کہ ان سب معاملات میں وہ اسلام کا نقطۂ نظر اختیار کرے اور اسلام کے اصولوں پر چلے ۔ اس سے یہ کہنا کہ تو ہندوستان کی اجتماعی زندگی میں اپنی مسلمان ہونے کی حیثیت کو الگ کر کے ہی حصہ لے سکتا ہے، دراصل اس سے یہ کہنا ہے کہ تو ہندوستان میں مسلمان بن کر نہیں رہ سکتا۔ دوسری قوموں کے متعلق تو ہمیں کچھ کہنے کا منصب نہیں، مگر مسلمانوں کے متعلق ہم بلاخوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے لئے یہ پوزیشن کسی طرح قابل قبول نہیں ہے ۔ علاوہ بریں اگر عمومی حاکمیت کی تفسیر یہ کی جائے کہ ملک کی حکومت میں ہمارا حصہ صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ہے تو اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ہماری زندگی دو الگ الگ خانوں میں تقسیم ہو جاتی ہے ۔ ایک خانہ ہندوستانیت* کا ہے جس میں ہم حکومت کی طاقت اور اس کے اختیارات سے محروم ہیں ۔ بالفرض یہ تقسیم صحیح بھی ہو تو سوال یہ ہے کہ اپنی زندگی کے اس دوسرے خانے کو درست کرنے اور درست رکھنے کے لئے جن وسائل و ذرائع، جن اختیارات و اقتدارات کی ہمیں ضرورت ہے وہ ہم کہاں سے

* یہ ہے جس طرح [illegible] حیثیت

لائیں گے۔ وطنی حکومت میں سے تو یہ چیزیں ہم کو مل نہیں سکتیں کیونکہ اس میں ہمارا حصہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں ہے۔ کہیں باہر سے بھی ہم اسے نہیں لا سکتے۔ اور خود اپنے اندر سے بھی اسے پیدا نہیں کر سکتے کیونکہ ان دونوں صورتوں میں وطنی حکومت سے تصادم ہوتا ہے۔ پس لامحالہ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کو آزادی وطن کے بعد بھی آزادی میسر نہ ہو، اور ہماری تہذیب کا نظام جس طرح انگریز کی غلامی میں زندگی کے اسباب اور ترقی کے وسائل نہ پانے کے سبب سے مضمحل ہو رہا ہے اسی طرح آزادی ہند کے دور میں بھی مضمحل ہوتا چلا جائے ——

کوئی شخص جو دستوری مسائل کا ذرہ برابر بھی فہم رکھتا ہو، اس نتیجہ کا انکار نہیں کر سکتا، اور کوئی شخص جس کے دل میں اسلام کی ذرہ برابر بھی وقعت اور مسلمان رہنے کی کچھ بھی خواہش موجود ہو، اس نتیجہ کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ہمارے لئے اس امر پر اصرار کرنا قطعاً ناگزیر ہے کہ آزاد ہندوستان کے جمہوری نظام میں ہمارا حصہ "مسلم ہندوستانی" ہونے کی حیثیت سے ہونا چاہیے نہ کہ محض ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے۔

یہ تین اہم ترین نکات ہیں جنہیں آئندہ کے لئے مسلمانوں کی قومی پالیسی اور انکے سیاسی نصب العین کا سنگ بنیاد قرار دینا چاہیئے —— ان میں یک سرمو بھی کسی ترمیم کی گنجائش نہیں ہے، اس لئے کہ ان نکات سے ہٹنا دراصل موت کے گڑھے میں جانا ہے —— اب یہ ظاہر بات ہے کہ برٹش گورنمنٹ کا بنایا ہوا دستور حکومت اور کانگریس اور مہاسبھا دونوں کا نصب العین ہمارے ان نکات سے اصولاً متصادم ہوتا ہے اور ہمارے لئے لازم ہو جاتا ہے کہ اسکو بالکلیہ رد کر دیں لیکن محض رد کر دینا کافی نہیں ہے۔ یہ محض سلبی چیز ہے جس پر کسی عمارت کی تاسیس نہیں ہوتی۔ ہمیں ایجابی طور پر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتانا چاہیئے کہ ہمارے نکات کی بنیاد پر کونسا دستور حکومت بنایا جا سکتا ہے جو ممکن العمل بھی ہو، ملک کی دوسری قوموں کیلئے قابل قبول بھی ہو اور جس میں ہمارے قومی حوصلے بھی ٹھیک ٹھیک پورے ہو سکتے ہوں۔

اس سلسلہ میں ہمارے سامنے مستقبل ہند کی تعمیر کے لئے تین خاکے آتے ہیں جنہیں ہم

الگ الگ پیش کریں گے۔

پہلا خاکہ

دو یا زائد قوموں کے ملک میں ایک جمہوری ریاست بنانے کی صحیح اور منصفانہ صورت یہ ہے:۔

اولاً وہ بین الاقوامی وفاق (INTERNATIONAL FEDERATION) کے اصول پر مبنی ہو، یا دوسرے الفاظ میں وہ ایک قوم کی ریاست نہیں بلکہ متوافق قوموں کی ایک ریاست ہو (A STATE OF FEDERATED NATIONS)

ثانیاً اس وفاق میں شریک ہونے والی ہر قوم کو تہذیبی خود اختیاری (CULTURAL AUTONOMY) حاصل ہو۔ یعنی ہر قوم اپنے مخصوص دائرۂ زندگی میں اپنے گھر کی تنظیم و اصلاح کے لئے حکومت کے اختیارات استعمال کر سکے۔

ثالثاً مشترک وطنی معاملات کے لئے اس کا طرز عمل مساویانہ حصہ داری (EQUAL PARTNERSHIP) پر تعمیر کیا جائے۔

ہندوستان کے حالات کو سیاسی نقطۂ نظر سے سمجھنے اور حل کرنے کی جن لوگوں نے کوشش کی ہے انہوں نے یہ بات تو تسلیم کر لی ہے کہ اس ملک کیلئے وحدانی (UNITARY) طرز کی حکومت موزوں نہیں ہے بلکہ یہاں ایک اسٹیٹ اگر بن سکتا ہے تو وہ صرف وفاقی اصول پر بن سکتا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ وہ حالات کے صرف ایک پہلو کو دیکھکر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں، دوسرا پہلو انکی نگاہوں سے اوجھل رہ گیا ہے۔ انہوں نے صرف اس حد تک واقعات کو دیکھا اور سمجھا کہ یہاں دیسی ریاستیں اور برٹش انڈیا کے صوبے ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور خود صوبوں کی زبان، روایات، معاشرت اور عمرانی مسائل میں کافی تفاوت ہے۔ اسلئے وہ صرف اس نتیجہ تک پہنچ سکے کہ ان سب کو ایک مرکزی اقتدار کا بالکلیہ تابع بنا دینا درست نہیں ہے، بلکہ انکی اندرونی خود مختاری کو برقرار رکھکر انکے درمیان وفاقی تعلق قائم کرنا چاہئے۔ لیکن واقعات کے اس پہلو پر انکی نگاہ نہیں پہنچی کہ یہاں پر ریاستوں

اور صوبوں کی طرح، قوموں کے درمیان بھی اصول تہذیب، طرز زندگی، روایاتِ قومی، اور ضروریات اجتماعی میں کافی تفاوت ہے۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے اُنہوں نے مختلف قوموں کو ایک وحدانی طرز کی حکومت میں باندھ کر رکھدیا، درانحالیکہ جو وجوہ ریاستوں کے معاملہ میں وفاقی اصول اختیار کرنے کے مقتضی ہوئے ہیں۔ ان سے زیادہ قومی وجوہ قوموں کے معاملہ میں وفاقی اصول اختیار کرنے کے مقتضی ہیں۔

وفاق کی روح کیا ہے؟ مختصراً اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ جو جماعتیں کچھ ایسے مشترک اغراض و مفاد رکھتی ہوں کہ ایک دوسرے سے علیحدہ زندگی بسر کرنا اُن کے لئے ممکن نہ ہو، اور اُس کیساتھ اُنکے کچھ مخصوص حالات بھی ہوں جن کی بنا پر وہ بالکل ایک دوسرے میں مدغم ہو جانا بھی گوارا نہ کر سکتی ہوں، وہ آپس میں ملکر اس طرح کی ایک مصالحت (COMPROMISE) کر لیتی ہیں کہ اپنے مخصوص معاملات میں اُنکی خود مختاری بھی برقرار رہے اور مشترک معاملات میں اشتراک عمل بھی ہو سکے۔ اس قسم کے وفاق میں مرکز اور وفاقی اجزا کے درمیان حاکمیت منقسم ہو جاتی ہے۔ مرکز اور ہر ایک وفاقی جزو اپنے اپنے دائرہ عمل میں مختار ہوتا ہے۔ نہ ایک کو دوسرے کے دائرے میں گھس آنیکا اختیار ہوتا ہے اور نہ آئینی حیثیت سے کسی ایک کو یہ اقتدار حاصل ہوتا ہے کہ دوسرے کو مٹا دے۔ اسطرح کی مصالحت یہ موقع بہم پہنچا دیتی ہے کہ مختلف النوع جماعتیں مشترک ضروریات کیلئے ملکر ایک اسٹیٹ بنا سکیں

وفاق کی اس روح کو سمجھ لینے کے بعد کسی سیاسی فہم و بصیرت رکھنے والے شخص کیلئے اس حقیقت کا ادراک کر لینا مشکل نہیں ہے کہ اس نوعیت کا وفاق جسطرح ریاستوں (یعنی الگ الگ جغرافی خطے رکھنے والی جماعتوں) کے درمیان ہو سکتا ہے، اسطرح قوموں یعنی ایک ہی جغرافی خطہ میں رہنے والی مختلف المذہب یا مختلف التمدن جماعتوں کے درمیان بھی ہو سکتا ہے۔ البتہ اصول وفاق کا انطباق (APPLICATION) دونوں صورتوں میں مختلف طرز پر ہوگا۔ متوافق ریاستوں اور مرکز کے درمیان اختیارات کی تقسیم جس طریقہ پر کیجاتی ہے، متوافق قوموں کے درمیان وہ اس سے مختلف طریقہ پر ہوگی۔ پہلی چیز کو ہندوستان میں صوبائی خود اختیاری سے تعبیر کیا گیا ہے، دوسری چیز کو ہم "تہذیبی خود اختیاری" (CULTURAL AUTONO-MY) سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے بنیادی اصول حسب ذیل ہونے چاہئیں

(۱) وفاقی اسٹیٹ بنانیوالی ہر قوم صاحب حاکمیت قوم (SOVEREIGN NATION) ہو، یعنی وہ اپنے دائرہ عمل میں خود حکومت کے اختیارات استعمال کرے۔

(۲) تعلیم، مذہبی معاملات (مثلاً عبادت گاہوں اور اوقاف کا نظم و نسق اور مذہبی احکام کو اپنے افراد قوم پر نافذ کرنا اور ان احکام کے خلاف انکی سرکشی کو روکنا) اور مخصوص تمدنی و معاشرتی مسائل (مثلاً نکاح، طلاق، وراثت اور قومی طرز معاشرت (NATIONAL SOCIAL SYSTEM) میں ہر قوم کو پوری حکومت خود اختیاری حاصل ہو اور مرکز کو اس میں دخل دینے کا حق نہ ہو۔

(۳) ان اغراض کیلئے ہر قوم کی الگ الگ ضلعدار اور صوبہ وار کونسلیں ہوں اور ان پر ایک سپریم کونسل ہو، مذکورہ بالا معاملات انہی کونسلوں میں پیش ہوں اور وہیں سے انکے لئے قوانین منظور کئے جائیں۔ ان قوانین کا مرتبہ عام ملکی قوانین کے مرتبہ سے کسیطرح کم نہ ہو۔ انکو نافذ کرنیکے لئے ایک مستقل ہیئت انتظامیہ (EXECUTIVE) ہو اور وہ قومی کونسل کے سامنے جوابدہ ہو۔ مصارف نظم و نسق کیلئے ٹیکس عائد کرنے اور وصول کرنیکے پورے اختیارات اس قومی نظام کو حاصل ہوں۔ اور ملکی خزانہ میں سے ایک مخصوص حصہ ہر قوم کیلئے مقرر کر دیا جائے جسطرح وفاقی ریاستوں اور وفاقی مرکز کے درمیان مالیات کی تقسیم ہوا کرتی ہے۔

(۴) متوافق قوموں کے درمیان، یا کسی وفاقی جز اور مرکز کے درمیان جو آئینی اختلافات پیدا ہوں اُن کا تصفیہ وفاقی عدالت (FEDERAL COURT) کرے۔

(۵) اپنے مخصوص قوانین کے مطابق فصلِ خصومات کرنیکے لئے ہر قوم کا مستقل عدالتی نظام بھی ہو جسے عام ملکی عدالتوں کی طرح پورے عدالتی اختیارات حاصل ہوں۔

اس مرحلہ پر تہذیبی خود اختیاری کے صرف اصول بیان کئے جا سکتے ہیں۔ اگر ان پر اتفاق ہو جائے تو انکا تفصیلی نقشہ ایک بین الاقوامی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس یا آئین ساز مجلس (CONSTITUENT ASSEMBLY) میں بنایا جا سکتا ہے[۱]

(۱ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

اس کے بعد مرکزی حکومت کا سوال سامنے آتا ہے۔ مرکزی حکومت سے یہاں ہماری مراد ریاستوں کے وفاق کا مرکز نہیں ہے بلکہ قوموں کے وفاق کا مرکز ہے، یعنی وہ نظام حکومت جسے متوافق قومیں اپنی مشترک اغراض کیلئے بنائیں۔ اس معنی میں صوبوں اور ریاستوں کی حکومت بھی اسیطرح مرکزی ہے جسطرح وفاقی مرکز (FEDERAL CENTRE) یہ مشترک نظام حکومت لامحالہ "مساویانہ حصہ داری" کے اصول پر مبنی ہونا چاہیئے۔ اسلئے کہ یہ مشترک حاکمیت قوموں کا وفاق ہے نہ کہ ایک قوم کا وحدانی نظام حکومت۔ یہاں پوری احتیاط کیساتھ اس امر کا انتظام کرنا پڑیگا کہ اصول جمہوریت کے لحاظ سے ایک وفاقی جزو کو جو حاکمیت حاصل ہے، دوسرا وفاقی جزو اسے سلب نہ کرلے۔ تہذیبی خود اختیاری کی طرح اس کا بھی ایک ڈھانچہ بنا کر ہم یہاں پیش کرتے ہیں جس کی تفصیلی صورت بعد میں ایک آئین ساز مجلس بنا سکتی ہے۔

(۱) اسٹیٹ کے تشریعی، انتظامی، عدلی اور دفاعی، چاروں شعبوں میں ہر قوم کا حصہ[1] (حاشیہ اگلے صفحہ پر) اُس کی آبادی کے تناسب سے مقرر کردیا جائے جو تناسب کے تغیرات کے ساتھ ساتھ متغیر ہوسکتا ہو۔ پاسنگ (WEIGHTAGE) کا طریقہ بالکل اُڑا دیا جائے۔

(۲) موجودہ طریق انتخاب کو بھی بالکل بدلدیا جائے۔ چھوٹے چھوٹے حلقہ ہائے انتخاب بنانیکے بجائے ایک ریاست کے پورے حدود ارضی کو ایک حلقۂ انتخاب قرار دیا جائے جس میں ایک ایک نشست کیلئے الگ الگ امیدوار کھڑے نہ ہوں بلکہ تسلیم شدہ سیاسی جماعتیں (RECOGNISED POLITICAL PARTIES) اپنے اپنے امیدواروں کی فہرستیں پیش کریں اور انکو کامیاب کرنیکے لئے جدوجہد کریں۔ اس صورت میں (اور یاد رکھئے کہ صرف اسی صورت میں) جداگانہ انتخاب کے طریقہ کو موقوف کردینا چاہیئے، اس لئے کہ پھر بند قلعوں میں رہنا ہر قوم کے لئے

(حاشیہ [1]) بعض جہلا اس موقع پر فوراً بول اُٹھتے ہیں کہ اسلام میں زانی اور سارق اور قاذف کیلئے جو حدیں مقرر ہیں یا ہندو شاستر میں جو مخصوص قوانین ہیں، کیا انکو جوں کا توں نافذ کیا جائیگا؟ یہ سوال سراسر ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ابتدائی مرحلہ میں بین الاقوامی تعلقات کا تناسب قائم کرنے کیلئے ہم صرف ان قوانین کے نفاذ پر زور دینگے جو عام ملکی قوانین سے متصادم نہ ہوتے ہوں۔ اسکے بعد ہر قوم اپنی تہذیب کے اصولوں کا مظاہرہ کرکے اور انکے حق میں علمی و عقلی دلائل پیش کرکے رائے عام کو ہموار کرنیکی کوشش کرتی رہیگی اور جسکی تہذیب کے اصول زیادہ طاقتور ہونگے وہ عام ملکی قوانین کو متاثر کرنیمیں کامیاب ہوجائیگی

مضر ہوگا۔ جداگانہ طریقِ انتخاب کی ضرورت صرف اُسوقت تک ہے جبتک کہ یہاں انگلستان کی بوسیدہ ڈیمو کریسی کے نمونہ پر چھوٹے چھوٹے یک نشستی حلقہائے انتخاب بنائے جاتے ہیں۔ یورپ کی جدید جمہوریتوں میں متناسب نمائندگی (PROPORTIONAL REPRESENTATION) کے جو تجربات کئے گئے ہیں، اگر اُن سے استفادہ کرکے ایک زیادہ صحیح جمہوری طریقِ انتخاب اختیار کر لیا جائے تو پھر جداگانہ انتخاب کو اُڑا دینا ہوگا تاکہ اولاً آبادی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی نمائندگی سے محروم نہ رہ سکے، ثانیاً مقابلہ اشخاص کا اشخاص سے نہ ہو بلکہ پارٹیوں کے اصول اور پروگرام ایک دوسرے کے مقابلہ میں آئیں، اور ثالثاً ہر پارٹی اپنے اصول اور پروگرام لے کر سب قوموں کے پاس جا سکے۔ بہت ممکن ہے کہ ابتداءً ہم اپنے نظم کی کمزوری کے باعث کسی زیادہ منظم جماعت کے مقابلہ میں شکست کھا جائیں، لیکن تہذیبی خود اختیاری کے بعد یہ شکست ہمارے لئے کچھ زیادہ مضر نہ ہوگی، اور مزید برآں کھلے مقابلہ ہی میں زور آزمائی کرنے سے ہم سیاسی تنظیم کا سبق سیکھ سکیں گے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ مقابلہ آزادانہ اور مساویانہ ہو۔ اس کے بعد اگر ہم اپنے نظم کی کمزوری یا اپنے اصول اور پروگرام کی کمزوری کے باعث شکست کھائیں گے تو اس شکست کے مستحق ہوں گے۔

(۴) جمہوریت کو مؤثر بنانے کے لئے استصواب عام (REFERENDUM) کا طریقہ اختیار کیا جائے نیز رائے دہندوں کو یہ حق بھی دیا جائے کہ جن نمائندوں پر ان کو اعتماد نہ رہا ہو انکو واپس بُلا لیں۔ یہ بھی انگلستان کی دقیانوسی جمہوریت کا سراسر غیر جمہوری طریقہ ہے کہ نمائندوں کو منتخب کرنے کے بعد رائے دہندے ایک معیّن

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) ؎ خود غرض لوگ یہاں یہ اعتراض پیدا کر دیتے ہیں کہ اس طرح حصّے مقرر کرنے سے مناصبِ حکومت کی اہلیت (EFFICIENCY) متاثر ہو جاتی ہے۔ مگر یہ محض ایک فریب ہے اور اسکا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں کہ اپنے حق سے زیادہ جو لوگ لے چکے ہیں۔ وہ اسکو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ ورنہ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ کسی قوم میں اہل آدمیوں کی اتنی کمی نہیں ہے کہ وہ نظامِ حکومت کو چلانے کیلئے اپنے تناسب آبادی کے مطابق کام کے آدمی نہ دے سکتی ہو۔ حصّہ کے سوال کو یہ معنی پہنانا کہ ہم اہلیت کے بجائے محض قومیت کو مدارِ انتخاب قرار دینا چاہتے ہیں ایک ذلیل قسم کی چالاکی ہے۔

مدت تک اپنے ہاتھ کٹوا بیٹھتے ہیں روسو کے بقول انگریز صرف اُس وقت آزاد ہوتے ہیں جب وہ پارلیمنٹ کے ارکان کا انتخاب کرتے ہیں اور جب وہ اُنہیں منتخب کر لیتے ہیں تو پھر اپنے ہی منتخب کردہ نمائندوں کے غلام بن جاتے ہیں۔

(۴) استصواب عام کیساتھ یہ اصول مقرر کر دیا جائے کہ جس چیز کی مخالفت ایک قوم کے ووٹر بالاتفاق یا عظیم اکثریت کے ساتھ کریں وہ مجلس قانون ساز میں پاس نہ ہو سکے، کیونکہ یہ مخالفت اس بات کی دلیل ہوگی کہ جمہوری نظام کے حصہ داروں میں سے ایک حصہ دار اسکو اپنے لئے مضر پاتا ہے اور دوسرا حصہ دار صرف اس لئے اس کا مؤید ہے کہ وہ اس کے لئے مفید ہے۔ اس قسم کے کسی قانون یا ریزولیوشن کا پاس ہونا عین اصولِ جمہوریت کی نفی ہوگا۔

(۵) استصواب عام کے لئے یہ اصول بھی مقرر کرنا پڑیگا کہ اگر کسی قوم کے ووٹروں کی کم از کم اسقدر فی صدی تعداد استصواب کا مطالبہ کرے تو اس کا انعقاد ضروری ہوگا۔

(۶) دستور کی ترمیم پر بھی سخت پابندیاں عائد کرنی ہونگی جن کے لئے امریکہ، سوئٹزرلینڈ، آسٹریلیا، اور دوسرے جمہوری ممالک کے دساتیر سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا خاکہ

اگر بین الاقوامی وفاق کی یہ صورت قبول نہ کی جائے تو دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مختلف قوموں کے لئے الگ الگ حدود ارضی مقرر کر دیئے جائیں جہاں وہ اپنے جمہوری اسٹیٹ بنا سکیں۔ پچیس سال یا اس سے کچھ کم و بیش مدت تبادلۂ آبادی کے لئے مقرر کر دی جائے۔ ہر اسٹیٹ کو زیادہ سے زیادہ اندرونی خود مختاری دی جائے، اور وفاقی مرکز کے اختیارات کم سے کم رکھے جائیں۔ اس صورت میں غیر مسلم ریاستوں کے ساتھ ملکر ایک وفاقی اسٹیٹ بنانے پر نہ صرف راضی ہو جائینگے، بلکہ اس کو ترجیح دینگے۔

میرے دوست ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب نے حال میں ہندوستان کے تہذیبی مستقبل

(CULTURAL FUTURE OF INDIA) پر جو مقالہ حیدرآباد سے شائع کیا ہے وہ ہندستان کی مختلف قوموں کے درمیان ارضی حدود کی تقسیم کا بہترین نقشہ پیش کرتا ہے۔ یہ ایک منصفانہ تقسیم ہے جس کی رو سے مشرقی بنگال، حیدرآباد، بھوپال، جوناگڈھ، جاورہ، ٹونک، اجمیر، دہلی و اودھ، شمالی و مغربی پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے حلقے مسلمانوں کے لئے مخصوص ہو جاتے ہیں۔ اس طرح یہ ممکن ہے کہ پچیس سال کی مدت میں ہندوستان کے دوسرے خطوں سے ہجرت کر کے مسلمان ان حلقوں کے اندر سمٹ جائیں اور ہندو قریب کے علاقوں میں چلے جائیں۔ بقیہ ہندوستان میں اگر اچھوت اپنی الگ قومیت بنانا چاہیں تو اُن کے لئے بلحاظ اُن کی آبادی کے مستقبل رقبے معین کئے جا سکتے ہیں (بشرطیکہ گاندھی جی خودکشی کی دھمکی دیکر اُن کی آزادئ رائے کو پھر نہ سلب فرمالیں) اسیطرح سکھوں کو بھی اُن کی آبادی کے لحاظ سے ایک رقبہ دیا جا سکتا ہے۔

تیسرا خاکہ

اگر یہ صورت بھی منظور نہ ہو تو پھر مجبوراً ہم یہ مطالبہ کریں گے کہ ہماری قومی ریاستیں الگ بنائی جائیں اور اُن کا علیحدہ وفاق ہو، اسی طرح ہندو ریاستوں کا بھی ایک جداگانہ وفاق ہو، اور پھر ان دو یا زائد وفاقی مملکتوں کے درمیان ایک طرح کا تحالف (CONFEDRACY) ہو جائے، جس میں مخصوص اغراض مثلاً دفاع اور مواصلات (COMMUNICATIONS) اور تجارتی تعلقات کے لئے مقرر شرائط پر تعاون ہو سکے۔

یہ تین خاکے جو ہم نے تجویز کئے ہیں، ان میں سے جس کو بھی قبول کر لیا جائے اس پر ہم مفاہمت کر سکتے ہیں۔ اور اگر کوئی چوتھی یا پانچویں صورت پیش کی جائے تو اس پر بھی غور کر سکتے ہیں۔ مگر ہمارے ہندو ہمسایوں اور اُن کے انگریز سرپرستوں کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ موجودہ کانسٹی ٹیوشن

اور ہر وہ نظام حکومت جو واحد قومیت کی بنا پر جمہوری ادارات قائم کرتا ہو کسی حال میں ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں ہے۔ اس بنیادی غلطی سے پاک کرکے جو دستور بھی پیش کیا جائے اُس کو اور صرف اسی کو زیرِ غور لایا جا سکتا ہے۔

اپنے قومی نصب العین کی اس تشریح کے بعد ہمارے لئے آخری سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اس کو حاصل کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟ یہاں اس سوال کی تفصیلات پر بحث کرنے کا موقع نہیں مختصراً ایک بات میں صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ حالات جس حد تک پہنچ گئے ہیں ان میں ہمارے لئے انقلابی ذرائع اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے قومی رہنماؤں اور سیاسی اداروں نے گذشتہ دس پندرہ سال کی مدت میں انتہا درجہ کی بے بصیرتی اور ناعاقبت اندیشی سے کام لیا ہے، اور اس کے برعکس ہماری ہمسایہ قوم کو اعلیٰ درجہ کے دانشمند اور مدبر رہنما میسّر آ گئے ہیں۔ اس نامساوی مقابلہ کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج ہم اس ملک کے سیاسی ترازو میں بہت بے وزن ہیں اور اُن کا پلڑا بہت جُھک چکا ہے۔ اب وہ اپنی کامیابی کی منزل سے بہت قریب ہو چکے ہیں، اور متعدد اسباب سے، جن کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں، انگریز بھی دانستہ و نادانستہ وہی طریق دستور سازی اختیار کرنے پر اصرار کر رہا ہے جو سراسر اُنہی کے لئے مفید ہے۔ ایسی حالت میں یہ توقع کرنا انتہا درجہ کی خام خیالی ہوگی کہ محض زور استدلال یا افہام و تفہیم سے یا آئینی چالوں سے ہم ہندوؤں اور انگریزوں کو انکے وہ اصول اور مقاصد یکسر بدل ڈالنے پر آمادہ کر سکینگے جو نہ صرف اُنکے عقیدے میں درست ہیں بلکہ انکی اغراض کیلئے مفید بھی ہیں۔ اب آئینی تدبیروں کیلئے کامیابی کا کوئی موقع باقی نہیں رہا ہے۔ اب کوئی پارلمنٹ اور کوئی اوکانل ہماری لڑائی نہیں جیت سکتا۔ اب صرف جان و مال کی قربانیوں ہی سے واقعات کی رفتار بدلی جا سکتی ہے۔ جبتک ہم یہ ثابت نہ کر دینگے کہ یہ کانسٹی ٹیوشن ہمارے زندہ مسوں پر نہیں بلکہ صرف ہماری قبروں ہی پر نافذ کیا جا سکتا ہے،

اور جبتک ہم اپنے عمل سے یہ نہ بتا دینگے کہ مسلمان اپنی قومی زندگی کیلئے مرنیکی طاقت رکھتا ہے اُسوقت تک اس کانسٹی ٹیوشن کا ایک خوشہ بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹے گا' اور نہ وہ قومی جمہوری لادینی اسٹیٹ ہم پر مسلط ہونیسے باز رہیگا۔ جس کے لانے پر انگریز' ہندو' اور ہمارے منافقین اور بہت سے صم بکم عمی فہم لایعقلون مل جل کر کوشش کر رہے ہیں مسلمان انتہا درجہ کے نادان ہونگے اگر وہ اب بھی حالات کی نزاکت کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھینگے۔ وہ ابھی تک اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ اُنکو یہ نمائشی جلسے اور جلوس اور کھوکھلے مظاہرے قومی ہلاکت سے بچا لینگے۔ وہ اُن لوگونکی لیڈری پر اعتماد کر رہے ہیں جن کے سامنے اپنی وزارت اور وجاہت کے سوا کوئی چیز نہیں' جو اپنی قوم کے لئے اپنا بال تک بیکا ہونا گوارا نہیں کر سکتے' جو مسلمانونکے مفاد کا تمام قصر اس لئے بلند آہنگیوں کیساتھ لیتے ہیں کہ ایوان وزارت پر اُن کا قبضہ رہے' جن کی بزدلی پر دشمنوں تک کو پورا پورا اعتماد ہے' جنہیں چیلنج کیا جاتا ہے کہ اگر تم ہمارے ساتھ جیل جانے اور لاٹھیاں کھانے کو تیار ہو تو ہم تمہاری ہر بات ماننے کیلئے تیار ہیں اور وہ اس چیلنج کو قبول کرنے کے بجائے کنّی کاٹ جاتے ہیں' جن کا حال یہ ہے کہ یورپ میں سرکار برطانیہ کو جنگ کا خطرہ پیش آتا ہے تو یہ سب سے پہلے آگے بڑھ کر اپنی وفادارانہ خدمات پیش کرتے ہیں۔ ایسے لیڈروں سے اگر مسلمان یہ توقع باندھے بیٹھے ہیں کہ یہ اُن کی کشتی کو بھنور سے نکال لینگے' تو میں پیشینگوئی کرتا ہوں کہ اُنکی کشتی ڈوب کر رہیگی۔ یہ تقریروں کا نہیں بلکہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ اگر مسلمان جینا چاہتے ہیں تو اُن کو اور خصوصاً اُن کے نوجوانوں کو اپنا گرم خون زندگی کے لئے بھینٹ چڑھانے پر تیار ہونا چاہئے۔

پوچھا جاتا ہے کہ انقلابی ذرائع سے تمہاری مراد کیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اسکا کیا جواب دوں۔ جبتک کہ قوم کی ایک بڑی تعداد ایک نصب العین پر متحد نہ ہو جائے اور ہر قیمت پر اُسے حاصل کرنے کا عزم صمیم اُسمیں پیدا نہو جائے' انقلابی ذرائع کی ایک فہرست پیش کر دینا کسی یاوہ گو ہی کا کام ہو سکتا ہے اور میں یاوہ گوئی سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔